ڈاکٹر سید عبداللہ

پاکستانی معاشرہ کی اسلامی اساس

گزشتہ ماہ پنجاب یونیورسٹی کے سینٹ ہال میں "پاکستانی قومیت کی اسلامی بنیاد" کے موضوع پر ایک مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی تھی۔ سپریم کورٹ کے جج جناب ایس۔ اے رحمٰن نے اس مجلس کی صدارت فرمائی اور میاں بشیر احمد، ڈاکٹر سید عبداللہ، چودھری نذیر احمد خاں، اور ڈاکٹر عبدالوحید نے مباحثہ میں حصہ لیا۔ جناب ڈاکٹر سید عبداللہ نے اپنے مقالے میں اس بات پر زیادہ زور دیا کہ پاکستان میں اسلامی رنگ کس طرح پیدا کیا جائے اور اس موضوع پر انہوں نے جن خیالات کا اظہار فرمایا وہ درج ذیل ہیں:

پاکستان میں اسلامی طرزِ حکومت اور اسلامی زندگی کا سوال بہت اہم اور غور طلب سوال ہے۔ پاکستان کا حصول یقیناً ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔ مگر اس میں کسی ایسے نظام کی ترویج جس کی اساس مذہب پر ہو، اس سے بھی بڑا کارنامہ ہوگا۔ یہ اس لیے کہ سیاسی فکر کی جدید تاریخ میں یہ ایک انوکھا تجربہ ہوگا اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بڑی تخلیقی اور تعمیری صلاحیتوں کی ضرورت ہوگی۔ مگر اس کو نافذ کرنے سے پہلے اپنے آپ کو اور دوسروں کو اس کی معقولیت اور افادیت کے بارے میں مطمئن بھی کرنا ہوگا۔ اسی لیے میں سمجھتا ہوں کہ اس سوال پر محض جذباتی طور پر نہیں۔ بلکہ عقلی اور عملی طور پر بھی سوچنا ضروری ہے۔

اس سلسلے میں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مغرب کے ترقی یافتہ نظاموں کو، جو اس وقت دنیا کے بیشتر حصوں میں رائج ہیں اور بظاہر کامیابی سے چل رہے ہیں، اپنا لینے میں کیا امر مانع ہے؟ مغرب کی علمی ترقیات اور سائنسی جستجوؤں کے میدان اتنے وسیع ہیں اور ان کے عملی انتظامات اور ادارے اتنے عمدہ اور چاق و چوبند ہیں کہ ان کے ہوتے ہوئے کسی نئے تجربے کی آخر ضرورت ہی کیا ہے؟ پاکستان ایک نیا تجربہ ہے اس لیے کہ اس وقت دنیا میں اسلامی طرزِ حکومت کا کوئی نمونہ موجود نہیں۔ ہمیں اسلامی نمونے کی حکومت قائم کرنے کے لیے پرانے تجربوں کو نئے تجربوں سے ہم آہنگ کرنا پڑے گا۔ اس صورت میں یہ نظام بھی بڑی حد تک ایک نیا ہی نظام ہوگا، جو پچھلے تمدنی تجربوں سے خاصا مختلف ہوگا۔ اس لیے میری رائے میں پاکستان میں اسلامی حکومت کا نظام، فکر اور عمل کی ایک نئی اور نادر تخلیق ہوگی اور اس لحاظ سے میں اس کو نیا نظام ہی سمجھوں گا۔

اس صورت میں معترض کہہ سکتا ہے کہ پھر مغربی نظاموں سے کسی ایک کو اپنا لینے میں کیا مضائقہ ہے؟ میں نے جب

کبھی اس سوال پر غور کیا۔ مجھے اس سے پیچھا چھڑانے میں خاصی دقت پیش آئی۔ مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ مغرب کے بنے بنائے نظاموں کو قبول کرنے کی سہولتوں کے باوجود، ان کے متعلق قدرے بے اطمینانی محسوس ہوئی۔

اس بے اطمینانی کے کئی اسباب ہیں ـــــ ایک بڑا سبب یہ ہے کہ مغرب میں جہاں حسنِ انتظام اور اہتمام و تکمیل کے شاندار حکومتی نمونے ملتے ہیں، وہاں یہ کمی اکثر صورتوں میں محسوس ہوتی ہے کہ وہاں کی سیاست کا بنیادی فلسفہ کسی نہ کسی شکل میں تخریبی ہے۔ اور اس کا یہ عیب نظام کی ظاہری خوبصورتی کے باوجود اس کی روح کو بدنما اور ناگوار بنا دیتا ہے۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ مغرب میں تبدیلی اتنی تیزی سے ہوتی ہے کہ کوئی چیز دیرپا نہیں۔ صبح سے شام تک یا شام سے صبح تک۔ بعض ملکوں میں، مثلاً فرانس میں تجربے کی عمر اس سے بھی کم ہے۔ یہ چیز ذہنی انارکی کا پتہ دیتی ہے۔

بے اطمینانی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ مغربی فلسفے کم و بیش پانچ صدیوں سے عجب انداز سے یک طرفہ اور یک رخے ہوتے جا رہے ہیں۔ انسان ہے تو خدا نہیں، مادہ ہے تو روح نہیں، عملی تجربے پر آئے تو عقلی علم کے مخالف، عقل ہے تو وجدان کے مخالف۔ اقرار بھی کیا تو یک رخا، مثلاً نیچر ہے تو سب کچھ یہی ہے۔ حواس ہیں تو سب کچھ یہی۔ روٹی ہے تو سب کچھ روٹی ہے۔ جدل ہے تو ہر جگہ جدل ہی جدل۔ غرض ان فلسفیوں کے یہاں عموماً کلیت نہیں پائی جاتی۔ ان کے یہاں حقیقت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر سامنے آتی ہے۔ اس سے خود فلسفے کو بہت نقصان پہنچا ہے۔ کسی فلسفۂ زندگی کی غایت یہ ہوتی ہے کہ وہ فرد اور اجتماع دونوں کے لیے راحت و آسودگی کا کوئی موثر پروگرام تجویز کرے۔ اور اس کے لیے عملی اصول بنائے۔ کسی فلسفۂ سیاست کا بھی بڑا مقصد، شاید واحد مقصد، یہ ہے کہ انسانی معاشرہ کی تشکیل کے ایسے اصول وضع کرے، جن کی مدد سے انسان زیادہ سے زیادہ راحت و آسودگی حاصل کر سکیں۔ اور نسلِ انسانی میں انتشار و افتراق کی بجائے زیادہ سے زیادہ اخوت کا جذبہ پیدا ہو۔ میں یہ بات بنتھم اور مل کے زیرِ اثر نہیں کہہ رہا ہوں، جن کا تصور بالآخر خود غرضی کی نوک پر جا اٹکتا ہے۔ بلکہ اس تصور کے ماتحت کہہ رہا ہوں کہ ایک اعلیٰ اخلاقی معاشرہ میں دوسروں کی خوشی کے لیے اپنی خوشی کی قربانی بھی ممکن ہے۔ میرے خیال میں کسی عمدہ فلسفۂ سیاست کے یہی دو بڑے نصب العین ہیں۔ مگر یورپ کے سیاسی تجربات کی پوری تاریخ اور ان کے موجودہ ادب کا پورا سرمایہ یہ گواہی دے رہا ہے کہ مغربی فلسفے ان غایتوں کو پورا کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

ذاتی اور انفرادی لحاظ سے بظاہر مغرب میں بڑا سکھ معلوم ہوتا ہے۔ مگر شاید یہ سکھ سطح پر ہے اندر نہیں۔ اور بے اطمینانی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہو گا کہ فلسفے کے آخری رہنما ـــــ وجودی ـــــ آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ زندگی کا سارا کاروبار عبث اور بے سود ہے۔ اور اجتماعی پیمانے پر ان فلسفیوں نے یہ قیامت ڈھائی کہ خدا کی مخلوق چھوٹی چھوٹی منفعتوں کے لیے صدہا جنگ آزما برادریوں اور متحارب فریقوں میں بٹ گئی۔ اور استحصال، استعمار، اور اجارہ داریوں کی ہوس اتنی بڑھی کہ ملک گیروں کی یلغار سے فلک پیر بھی نہ بچ سکا یہ سب کچھ سہانی فلسفیانہ اصطلاحوں کے نام سے کیا گیا

اور مقصد صرف اسی قدر تھا کہ اپنے آرام کے لیے دنیا کو کس طرح لوٹا جائے۔ یہ سب مصیبت مغرب کے مادی نقطۂ نظر سے پیدا ہوئی ہے۔ جو زندگی میں غیر اخلاقی قدروں کو روا رکھتا اور یورپ میں اس BOHEMIAN FREEDOM کا مبلغ ہے، جس کا اصل الاصول انکار، شک اور مادر پدر آزادی ہے ــــ کافکا، شپنگلر اور طامس من نے یوں بڑے بڑے دعوے کیے ہیں مگر اجتماعی فلسفہ ان کا بھی ناقص ہے۔ سائنس اپنی جگہ خوب تھی مگر جب اس نے فلسفہ بننا شروع کیا تو فلسفے کا کریلا مادیت کی نیم پر چڑھ کر اور بھی تلخ ہو گیا۔ یہ صحیح ہے کہ مغرب کے تمام کاموں میں جد وجہد، جستجو، چابک دستی اور لیاقت پائی جاتی ہے مگر ان تمام قابلیتوں کا نتیجہ بین الاقوامی سطح پر کوئی زیادہ حوصلہ افزا ثابت نہیں ہوا۔ اور مجھے تو بعض اوقات ان اقوام کو دیکھ کر بچوں کی تشبیہ سوجھتی ہے، جو کھیل کھیل میں ہی آپس میں اُلجھ پڑیں یا جیسے یہ جنات کا کوئی قبیلہ ہے جس کی فطرت ہی جنگ جوئی اور ریڑ کاری ہے۔ حالانکہ انفرادی اخلاق میں ان لوگوں پر فرشتہ ہونے کا گمان گزرتا ہے۔

اس گفتگو سے میں یہ نتیجہ نکالتا ہوں کہ مغربی نظاموں کی تنظیم و تعمیر تو اپنی جگہ خوب چیز ہے مگر ان کی اجتماعی روح کو کسی طرح مکمل اور اخلاقی نہیں کہا جا سکتا۔ ان حالات میں ہمیں کسی ایسے تصور یا نظریے کی ضرورت ہوگی، جو شخصی راحت اور اجتماعی آسودگی کی بہتر ضمانت دے سکتا ہو۔

میری رائے میں اس قسم کا آئیڈیل نظریہ وہ ہوگا، جو زندگی کو کل کی حیثیت سے دیکھتا ہو، جس کی بنیاد کسی اخلاقی تصور پر ہو، جو زندگی کے تضادوں میں اعتدال پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور جو حیات کی وسیع تر حدوں تک پہنچنے میں بھی مدد دے سکتا ہو اور قابل عمل اور معقول بھی ہو۔ یہ سب صفات اسلام میں موجود ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اجتہاد کے بند ہو جانے اور تقویٰ کی کمی کے باعث اسلام کے روشن نقوش بھی کچھ مٹ گئے ہیں اور کچھ داغدار ہو گئے ہیں۔

حسنِ اتفاق سے پاکستان اس وقت ایک دوراہے پر کھڑا ہے۔ وہ ایک ایسے تجربے کے انتظار میں ہے، جس میں اُس سے کارکنانِ قضا و قدر کی توقع یہ ہے کہ وہ مشرق و مغرب کے درمیان ایک سنگم بن جائے، جہاں مشرق و مغرب کی سب خوبیاں اور فضیلتیں اس میں جمع ہو جائیں! مغرب کی تمام تمدنی تجربات اس کے سامنے ہیں۔ ان پر وہ نظر ڈال سکتا اور عمدہ انتخاب کر سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ مغرب کی بے اعتدالیوں سے بچنے کا راستہ بھی اس کے پاس موجود ہے۔ اس سلسلے میں اسے مسلمانوں کے تمدنی تجربات سے استفادہ کرنا ہوگا اور اس روحِ شرافت اور روحِ انسانیت کو زندہ کرنا ہوگا جس کا اسلامی تہذیب کو ہمیشہ سے دعویٰ رہا ہے۔

پاکستان میں جو طرزِ حکومت بھی رائج ہو اس کے لیے یہ بہر حال ضروری ہوگا کہ وہ ان عملی تنظیمات سے استفادہ کرنے سے گریز نہ کرے، جن کے عمدہ تجربے یورپ نے کیے ہیں۔ مگر ان عملی تنظیمات کے اندر اسے وہ روح پیدا کرنی ہوگی جو اس کے اپنے دینی عقائد اور اس کی اپنی تہذیب کی روح ہے۔

اگرچہ میں ایک قابل اور مہذب دنیاوی حکومت کو بھی اس لحاظ سے خیر مقدم کہتا ہوں کہ اس سے خدا کی بادشاہت کا منشا ایک حد تک پورا ہو جاتا ہے۔ مگر میرا خیال یہ ہے کہ زندگی اور حکومت دونوں میں گہری روحِ شرافت اور گہری روحِ انسانیت اُس وقت تک جلوہ گر نہیں ہو سکتی، جب تک انسانوں سے بلند تر کسی احکم الحاکمین اور مادی دنیا کے باطن میں کسی وسیع تر روحانی دنیا کی موجودگی کا احساس اور اچھے بُرے کاموں کی جزا سزا کا عقیدہ بھی انسانوں کے اعمال و افعال پر اثر انداز نہ ہو۔ خالص دنیاوی حکومت ایک خشک کاروبار کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایسے خشک کاروبار میں عقل کا اطمینان تو ممکن ہے مگر اس میں وہ صلاحیت نہیں ہوتی جو اجتماعی کاموں میں بے غرض نیکی کی شان پیدا کر دے۔ اس کے لیے ذرا سے روحانی احساس کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ شے توحید و رسالت کے عقیدے سے پیدا ہو سکتی ہے۔

اسلامی اندازِ نظر کی ایک امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دین اور دنیا کا باہم ٹکراؤ نہیں۔ بلکہ زندگی کے یہ دونوں شعبے باہم گھل مل جاتے ہیں۔ میں اس نصب العین کو ایک نتیجہ خیز آئیڈیل سمجھتا ہوں۔ مگر اس سلسلے میں کچھ احتیاطوں کو ضروری خیال کرتا ہوں۔ دین کو دنیا بنا لینا اور دنیا کو دین بنا لینا ایک فلسفے کی حیثیت سے بہت اونچی بات ہے۔ مگر عمل میں یہ ہے بہت مشکل۔ میری رائے یہ ہے کہ معاملات میں دین اور دنیا کی حدوں کی الگ الگ وضاحت ضروری ہے۔ یہ میں اس لیے کہتا ہوں کہ زندگی کے عملی معاملات میں کوئی الجھن نہ رہے۔ اور ہر شخص کو اچھی طرح معلوم ہو کہ اسے کن کن معاملات میں عقلی طریقِ کار کا سہارا لینا ہے اور کن کن اُمور میں اُسے "تنہا بھی چھوڑ دے" پر عمل کرنا ہے۔ میرا احساس یہ ہے کہ ہمارے یہاں دین و دنیا کے غلط مبحث نے پہلے بھی کافی پیچیدگی پیدا کر رکھی ہے۔ اور اگر اس کی حدود متعین ہو جائیں تو زندگی کے کاموں کے متعلق حکومت اور افراد کو خاصی سہولت ہوگی۔ ورنہ بے اصول طور پر دین دنیا کو ملا دینے سے خدشہ یہ ہے کہ ہم نہ اچھے دین دار بن سکیں گے نہ اچھے دنیادار ہو سکیں گے۔ اس لیے میری رائے میں شعبوں کی واضح تقسیم کی بے حد ضرورت ہے۔ اس کے بعد دونوں میں ایک خوشگوار رابطہ پیدا کیا جا سکتا ہے۔

میں یہاں یہ بھی واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ بعض لوگ دانستہ یا نادانستہ تھیوکریسی کی بحث اٹھا کر اسلامی طرزِ حکومت کے مسئلے کو الجھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، اسلام میں 'تھیوکریسی' کبھی نہیں ہوئی۔ تھیوکریسی کا معنی ہے علما کی حکومت یا مذہبی لوگوں کی حکومت۔ مسلمانوں میں علماء کا اثر و رسوخ تو ایک مسلم چیز ہے، مگر علما کی حکومت کبھی قائم نہیں ہوئی۔ ہمارے یہاں کے حضرات نے یہ خیال شاید یورپ میں کلیسا کی تاریخ سے لیا ہے۔ مگر مسلمانوں میں چرچ کا الگ وجود نہیں۔ البتہ کچھ عرصے سے پڑھے لکھے لوگوں نے دین سے جو بے تعلقی اختیار کر رکھی ہے اُس کی وجہ سے ایک چرچ سا یہاں بھی بنتا جا رہا ہے۔ جس کو روکنے کی صورت صرف یہ ہے کہ دینی تعلیم میں قوم کے کھاتے پیتے لوگ بھی دلچسپی لیں تاکہ دینی علوم کسی ایک جماعت کا اجارہ نہ بن جائیں۔ ورنہ دینی علم حاصل کیے بغیر دین کے

مفسر بننے کی روش ایک بے وقارسی بات ہے اور اس سے پائیت کے فروغ کے امکانات بھی زیادہ ہو جائیں گے۔

اب رہا یہ سوال کہ پاکستان میں اسلامی طرزِ حکومت کا نفاذ کس طرح ہو؟

اس کے متعلق میری رائے یہ ہے کہ یہ کام تدریج سے ہونا چاہیئے۔ اس سلسلے میں پہلا کام یہ ہے کہ حکومت ایک قرارداد کے ذریعے اپنے اس ارادے کا واضح اعلان کر دے کہ وہ اس ملک میں اسلامی اصولوں کو نافذ کرنا چاہتی ہے تاکہ عوام کو حکومت کے عزائم کی اطلاع ہو جائے اور وہ حکومت کے پروگراموں کے ساتھ دلی تعاون کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔ اس کے ساتھ ہی حکومت کا فرض ہے کہ وہ ملک میں پاکستانی اور ملی فضا پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ خصوصاً حکومت کی اپنی تقریبات میں پاکستانی فضا اور پاکستانی ماحول پیدا کیا جائے۔ یہ بھی ضروری ہے کہ اسلامی روایات و عقائد کے لیے احترام کا رنگ نمایاں ہو۔ مسلمانوں کے ادبی اور علمی ورثوں کے تحفظ کے لیے اور ان کی تہذیبی روح کو محفوظ رکھنے کے لیے ایسے انتظامات کئے جائیں جن سے یہ خیال دُور ہو جائے کہ حکومت مغرب زدہ لوگوں کے زیرِ اثر ان ورثوں کو مٹا دینا چاہتی ہے۔

اس اثنا میں ایک دستورِ اساسی کی ترتیب اور اس کے ضمن میں فقہ جدید کی تشکیل کی ضرورت بھی واضح ہے ـــــ مگر فقہ جدید کی تشکیل کوئی آسان کام نہیں ـــــ اس غرض کے لیے ہر قسم کے ماہرین کی ضرورت پڑے گی۔ نہ صرف اسلامی علوم کے ماہروں کی بلکہ جدید سماجیات اور بین الاقوامی قانون کے ماہروں کی بھی۔ یہ سارے کام صبر آزما اور دیر طلب ہیں مگر یقین و ایمان کے سہارے اس راستے کی سب مشکلات دور ہو سکتی ہیں۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اسلامی آئیڈیالوجی کے نفاذ سے حکومت کی مشکلات میں اضافہ ہو گا اور اس کی ترویج کی خاطر ایسی انقلابی تبدیلیاں کرنی پڑیں گی جن سے پرانے داخلی اور خارجی نظام کے درہم برہم ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ جہاں تک میں غور کر سکا ہوں اس سلسلے میں حکومت کو کوئی خاص تکلیف پیش نہیں آئے گی۔ نہ حکومت کے انتظام میں کوئی فوری انقلابی تبدیلیاں پیدا ہونے کا امکان ہے۔ دین اسلام نام ہے چند عقیدوں، چند عبادتوں، چند آداب و اخلاق اور چند قوانین کا۔ اس سلسلے میں حکومت کا کام یہ ہے کہ عوام کو اسلامی زندگی اختیار کرنے میں مدد دے۔ مگر اسلامی زندگی پر عمل عوام کا اپنا کام ہے اور حکومت کے لیے ممکن نہیں کہ ہر لحظہ افراد کے عقیدوں اور عبادتوں میں دخل دیتی پھرے۔ البتہ معاملات، مجلسی امور اور بین الاقوامی امور میں قانون سازی حکومت کا فرض ہو گی۔ اس میں حکومت کو یہ دیکھنا ہو گا کہ اصولاً سارے قوانین اسلام کے منشار کے مطابق ہوں اور ان کی کوئی شق قرآن و سنت سے نہ ٹکراتی ہو۔ بہرصورت اس تمام سلسلۂ کار میں حکومت کا اصلی کام ایک محدود گوشے میں سمٹ کر رہ جاتا ہے۔ اور بیشتر کام پبلک سے متعلق ہے۔ اس کے سوا ملک داری کے جتنے انتظام موجود ہیں یا کئے جائیں گے ان میں عقل اور دوسری قوموں کے تجربوں سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔ علمی، عملی اور صنعتی ترقیات کا بھی سارا کام بدستور سابق چلتا رہے گا اور کسی قسم کی ابتری کا کوئی خدشہ باقی نہیں رہے گا۔

مذہبی یا اسلامی طرزِ زندگی کے متعلق ایک ڈر یہ بھی دلوں میں بیٹھا ہوا ہے کہ اس میں فرحت و تفریح کی گنجائش نہیں رہے گی اور اس طرح معاشرہ میں گھٹن پیدا ہو جائے گی۔ اس ڈر کے کئی اسباب ہیں۔ ایک یہ کہ ہم اسلامی تہذیب کے مزاج سے بے خبر ہو گئے ہیں۔ اور اسلام کی سماجی تاریخ پر ہماری نظر نہیں رہی۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو مغربی طرزِ زندگی کی لائی ہوئی تفریحات کے دلدادہ ہیں۔ انہیں ان کے چھن جانے کا خطرہ ہے۔ مثلاً سینما کے بند ہو جانے کے خوف سے میرے دل کی بھی عجب کیفیت ہو جاتی ہے۔ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کسی دوسری آئیڈیالوجی کے زیرِ اثر، ماضی کی ہر روایت کے مخالف ہیں۔ اور پرانے ہر نقش کو مٹا کر اپنے خاص طرزِ فکر کے لیے راستہ ہموار کرنا چاہتے ہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ ان میں سے صرف آخری طبقے کو مطمئن کرنا ہمارے بس کی بات نہیں، مگر باقی گروہوں کے اطمینان کے لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں نے ذوقِ زندگی کا گلا کبھی نہیں گھونٹا ـــــ ان میں احساسِ جمال اور فرحت کی ایک مستقل روایت ہمیشہ رہی ہے جس کی شہادت ان کے ادب اور فنون سے مل سکتی ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ جو چیز قوم کے مسلّم اخلاقی مزاج سے تصادم پیدا کرے گی اس کے لیے پروانہ راہداری حاصل کرنا دشوار ہو گا اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی یہی دستور ہے۔

ایک سمت سے یہ آواز بھی آ رہی ہے کہ کسی اسلامی نظام میں نئی اقدار کو جذب کرنا مشکل بلکہ محال ہے۔ اس خیال میں بھی وہی غلط فہمی یا مغالطہ انگیزی ہے جس کا ذکر میں روایت شکنوں کے ضمن میں کر چکا ہوں۔ میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ اسلام کا سارا نقطۂ نظر عملی اور تجربی گویا سائنٹفک ہے اس لیے اس کو سائنس اور ٹکنالوجی سے کوئی عداوت نہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ سائنس کا ہر تجربہ ایک عبادت کا درجہ رکھتا ہے۔ کیونکہ وہ معبودِ حقیقی کی حکمتوں کے قریب لے جا کر اس کی حقانیت کو ثابت کرتا ہے ـــــ نئی قدروں سے مراد اگر سائنس ہے تو اس کو جذب کرنے اور قبول کرنے میں کسی اسلامی نظام کو کوئی دشواری نہیں ـــــ لیکن اگر اس سے مراد وہ فلسفے بھی ہیں جو مادیت اور نسبی عقلیت اور انسان کو نرا حیوان یا جنس کا رسیا ثابت کرنے والے یا خدا کی ہستی میں شک پیدا کرنے والے یا انسان کو اس کے رتبے سے گرانے والے تصورات پر مبنی ہیں تو مجھے بے تکلف عرض کر دینا چاہیئے کہ ایسے فلسفوں سے اسلام بلکہ شرافت کی لڑائی یقینی ہے ـــــ ان کے خلاف خود عیسوی فلسفے کے علمبردار طامس اکویناس، برکلے، نیومین اور نئے طامسی لوگ یا عینیت پسند فلسفی مثلاً کانٹ وغیرہ بھی لڑتے رہے ـــ اور شاید کسی اسلامی اندازِ نظر کا پہلا فرض ہے بھی یہی کہ فکر و نظر کی ہر اس گمراہی کا مقابلہ کرے، جو مجموعی توازن کو بگاڑ کر خدا، کائنات اور انسان کے درمیان دیواریں کھڑی کرتا ہو۔ اور انسانی اخوت سے ہٹ کر فرقوں، گروہوں اور خطوں کی عصبیت کو فروغ دیتا ہو یا زندگی کی صرف مادی قدروں پر زور دے کر روحانی وسعتوں سے انکار کرتا ہو، میں فلسفہ کا مخالف نہیں ـــــ فلسفے کی جستجو ایک حد تک نہایت خوش آیند مشغلۂ علمی ہے مگر فلسفی جب زیادہ اونچا دیکھنے لگتا ہے تو وہ ناک کی سیدھ چلنے لگتا ہے اس حالت میں اس کا دیوار سے

ٹکرانا یقینی ہو جاتا ہے —— دشمن تو سامنے کھڑا ہے مگر فلسفی کی نظر آسمان پر ہے —— کم ازکم والٹیر نے یہی کیا تھا کہ دشمن کا پستول سینے پر تھا اور وہ بدی کی ماہیت دریافت کر رہا تھا۔ غرض اس خاص گوشے میں فلسفے سے اسلام کی لڑائی ناگزیر ہے۔

اس سلسلے میں پاکستانی طرزِ زندگی کا سوال بھی سامنے آتا ہے۔ طرزِ زندگی کا مسئلہ دراصل مشرقیت اور مغربیت کے بیچ میں الجھا ہوا ہے۔ میں اس سلسلے میں وسعتِ ذوق کا قائل ہوں۔ مجھے تو بعض مشرقی طریقے بھی بُرے معلوم ہوتے ہیں اور مغربی زندگی کے بہت سے طریقے نہایت خوش آیند اور قابلِ قبول ہیں۔ مغربیوں کے کھانے بدذائقہ سہی مگر ان کے غسل خانے تو دلکشا ہی ہوتے ہیں۔ بہرحال طریقے مشرقی ہوں یا مغربی ان میں سے جو بھی مسلمانوں کے اخلاقی مزاج کے مخالف ہیں ان سے الگ ہو جانے کی قربانی مستحق تحسین ہی ہوگی۔ پھر بھی اکثر صورتوں میں میرا ووٹ مشرقی طریقوں کے حق میں ہے۔ کم ازکم اس کی وجہ سے عام شہریوں سے ہم رنگی کا رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور سب کے ہم رنگ جینے میں ایک مزہ بھی ہے اور ایک طرح کی عظمت بھی۔ تاہم مشرقیت کو میں مذہب کا درجہ نہیں دیتا۔ اس کو زیادہ سے زیادہ ایک ذوقی مسلک قرار دیتا ہوں۔ اگرچہ مشرق میں رہ کر مشرقیت کے اچھے ذوق کے اظہار کو پسندیدہ ضرور خیال کرتا ہوں۔ ہاں اگر کوئی شخص پلاؤ کے مقابلے میں اُبلے ہوئے آلو کھانا پسند کرتا ہے تو میرا مشورہ یہ ہے کہ اس کو اُبلے ہوئے آلو کھانے دیجئے اور یہ کہہ کر معاف کر دیجئے کہ یہ اس شخص کے اپنے ذائقے کا سوال ہے۔ لب و دنداں اس کے اپنے ہیں اور کام و دہن اس کا اپنا:

دل از من، دیدہ از من، آستین از من کنار از من　　نمی دانم زمنعِ گریہ مطلب چیست ناصح را

البتہ یہ مشرقیت بھی عجیب چیز ہے کہ سڑکوں پر کیلے کے چھلکے یوں پھینکے جاتے ہیں گویا مچھلی کا شکار کر رہے ہیں اور یہاں کے بعض "صاحبوں" کی یہ مغربیت بھی کہ وہ مشرقی تہذیب کو مار کر اس کو دفن بھی "ویسٹ منسٹر ایبے" ہی میں کرنا چاہتے ہیں، لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئے گی:

میرے پتے سے خلق کو کیوں تیرا گھر ملے　　اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھ کو بعد قتل

آخر میں مجھے ایک بنیادی نکتہ پیش کرنا ہے جو ساری بحث کی جان اور اس سارے قصے کی روح ہے۔ وہ ہے افرادِ قوم میں اس اخلاقی مزاج اور روحانی طبیعت کی تربیت جس کے بغیر کوئی دینی نظام تو کیا کوئی بھی نظام نہیں چل سکتا!

اسلامی ادبیات کے مطالعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی حقیقی روح ہر مسلم و مومن میں ایک معتدل مزاج کی تخلیق کرنا چاہتی ہے۔ یہ مزاج ایمان، تقویٰ، طہارت اور عدل کی صفات کی داخلی تربیت سے پیدا ہوتا ہے۔ ایمان سے مراد ہے زندگی کی بلند تر اور نادیدہ وسعتوں پر یقین، تقویٰ سے مراد ہے اپنے حق پر قانع رہنا اور غیر حق سے بچنا، طہارت سے مراد ہے، ظاہری اور باطنی پاکیزگی اور شرافتوں کا احساس اور عدل سے مراد ہے، اپنے نفس سے اور دوسروں سے نباہ کرنے میں ضمیر اور عقل کی رائے پر چلنا۔ ان صفات کی نشوونما اور تربیت سے وہ نفسِ مطمئنہ مل سکتا ہے جو انسانی

زندگی کو انفرادی اور اجتماعی دونوں شعبوں میں سرچشمۂ راحت اور نتیجہ خیز بنا سکتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں حکومت کے اقدامات کی پرواہ اور انتظار کئے بغیر سب سے پہلے ایسے قومی مزاج کی تخلیق کے وسائل سوچنے چاہئیں جو ہر فرد کو اس قابل بنا دیں کہ وہ ہر مسئلے کو معقولیت، ایمانداری، دیانتداری اور ضمیر داری کے نقطۂ نظر سے دیکھ سکے۔ ظاہر ہے کہ جو سوسائٹی ایسے افراد پر مشتمل ہوگی اس کا بنایا ہوا ہر نظام اخلاقی ہوگا، اور ایک لحاظ سے اس قسم کا ہر اخلاقی نظام ایک حد تک دینی نظام ہی سمجھا جا سکتا ہے۔ ہمارے ملک کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ ضمیر داری اور دیانت داری کی ضرورت ہے۔ ہم جس منزل کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں اس کا نقطۂ آغاز یہی دو اخلاقی اصول ہیں۔

میں آج کی فرصت میں اُن اخلاقی قدروں کی تربیت کے وسائل پر بحث نہیں کر سکتا مگر یہ ضرور کہوں گا کہ جس ملک میں معمولی درجے کی ایمانداری اور ضمیر داری بھی نایاب ہو اس کو کسی اسلامی یا کسی مہذب نظام کی گفتگو شاید زیب نہیں دیتی۔ پھر بھی اس کے وسائل پر غور و فکر ضروری ہے۔ اس کے لیے حکومتی اقدامات کی بھی ضرورت ہے اور پبلک کے اپنے اقدامات کی بھی۔ مقصود سب کا یہ ہے کہ ملک میں اسلامی حکومت سے پہلے یا اس کے ساتھ ایک اسلامی مزاج پیدا کیا جائے۔

میرے خیال میں اس کا ایک بڑا وسیلہ اچھی تعلیم اور اسلامی ادبوں کا مطالعہ ہے جن کی روح بڑی حد تک اخلاقی ہے۔ اس مرکزی نقطے پر قائم رہ کر ہم مغرب کے سارے ادب خصوصاً اس ادب کا بھی مطالعہ کر سکتے ہیں جو ضمیر داری اور انسانی درد کے جذبے سے تخلیق ہوا ہے اور جس کے بڑے بڑے شاہکاروں کو میری نظر میں الہامی حیثیت حاصل ہے۔ بصورت دیگر ضمیر عامہ کو بیدار کئے بغیر اسلامی نظامِ حکومت یا مہذب طرزِ زندگی دونوں کی کامیابی میرے نزدیک مشکوک ہے۔

تاریخِ جمہوریت

مصنفۂ شاہد حسین رزاقی

قبائلی معاشروں اور یونانِ قدیم سے لے کر عہدِ انقلاب اور دورِ حاضرہ تک جمہوریت کی مکمل تاریخ جس میں جمہوریت کی نوعیت و ارتقاء، مطلق العنانی اور جمہوریت کی طویل کش مکش، مختلف زمانوں کے جمہوری نظامات اور اسلامی و مغربی جمہوری افکار کو بڑی خوبی سے واضح کیا گیا ہے۔ صفحات ۵۰۶۔ قیمت ۸/- روپے

ملنے کا پتہ: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ۔ کلب روڈ۔ لاہور